پروفیسر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی

''حجاز'' ------ قبول حق کیلئے بہترین خطّہ

(ایام جاہلیت کا عرب معاشرہ)

اشیاء اپنے اضداد سے پہچانی جاتی ہیں۔ دن کا تصور کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ مؤرخ، ادیب اور خطیب کوشش کرتے ہیں کہ ظہورِ اسلام کے نور کو اجاگر کرنے کیلئے دور جاہلیت کی تصویر تاریک تر بنا کر دکھائی جائے۔ ایام جاہلیت کے عرب معاشرے کو برائیوں میں اس طرح گھرا ہوا دکھایا جائے کہ اس سے زیادہ تصور ہی نہ کیا جا سکے۔ اس طرح ظہور اسلام کے معجزانہ تصور کو تقویت ملتی ہے مگر اس طرزِ فکر سے بعض حقائق دب جاتے ہیں جاہلیت کا معاشرہ یقیناً ایک غیر صالح اور بگڑا ہوا معاشرہ تھا مگر اتنا بگڑا ہوا بھی نہیں کہ اس میں قبول حق کی صلاحیت ہی ختم ہو جائے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ تمامتر جاہلیت کے باوجود بعثتِ ختم الرسل اور نزول قرآن مجید کے لئے کرۂ ارض پر بہترین اور مناسب ترین مقام خطہ حجاز ہی تھا اور حجازی معاشرہ اپنی تمامتر جاہلیت کے باوجود قبول حق کے لئے موزوں ترین معاشرہ تھا۔

لفظ ''اللہ'' خداوند کریم کا ذاتی نام ہے: اسم ذات، اسم معرفہ، عرب میں اللہ کا نام موجود تھا جبکہ ہندوستان، چین جاپان، وسطی افریقہ، جنوبی افریقہ، یونان اور پورے یورپ میں لوگ اللہ کے نام سے واقف نہ تھے بلکہ قیاس تو یہ رخ اختیار کرتا ہے کہ لفظ اللہ عرب کے علاوہ صرف ان سرحدی علاقوں میں موجود تھا جن سے عربوں کے تجارتی تعلقات تھے اہورامزدا تھا یزدان تھا، زردان تھا، زیس تھا جیوپیٹر تھا۔ پرماتما تھا، ایشور تھا، پربھو تھا (غالباً خداوند اور خدایگاں بھی تھا) اللہ نہیں تھا، جبکہ ادھر عرب میں عبداللہ عام نام تھا۔ عبداللہ نام کے بہت سے لوگ موجود تھے۔ خود حضور اکرم ﷺ کے والدِ گرامی کا نام عبداللہ تھا۔ عبیداللہ بھی متعارف نام تھا۔

مشرکین عرب کے نزدیک خدائے بزرگ و برتر اللہ ہی تھا۔ وہ اللہ کو زمین و آسمان اور شمس و قمر کا خالق، مالک اور ناظم مانتے تھے البتہ اس کے شریک بنا رکھے تھے یعنی وہ بتوں کو پوجتے تھے اور ان بتوں کو اللہ کے ہاں تقرب کا ذریعہ سمجھتے تھے جو شرک ہے۔ بہرحال اللہ کا تعارف کرانے کی ضرورت نہ تھی۔ توحید کی غرض سے عربوں کو صرف یہ سمجھانا تھا کہ اللہ ہی واحد الٰہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

عربوں کے ہاں اہم دستاویزات اور معاہدات اللہ کے نام سے شروع کئے جاتے تھے الفاظ تھے ''باسمک اللّٰھم'' معاہدۂ مقاطعہ بنی ہاشم انہی الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔ معاہدہ صلح حدیبیا انہی الفاظ سے شروع ہوتا ہے اور غالباً

معاہدہ حلف الفضول بھی انہی الفاظ سے شروع ہوا ہوگا کیونکہ یہ دستاویزات لکھنے کا عام طریق تھا۔

چالیس سال کی عمر میں حضور ﷺ نے اعلان رسالت فرمایا۔ تیرہ سالہ مکی زندگی اور دس سالہ مدنی زندگی۔ کل تیئیس سال کی مدت میں کارِ رسالت مکمل ہوگیا اور حجۃ الوداع کے موقع پر میدان عرفات میں تکمیل دین کی بشارت آ گئی۔ غور فرمایئے کہ اگر اللہ تعالیٰ جو قادر مطلق ہے حضورؐ کو نبی آخر الزماں کی حیثیت سے گورکھ پور (ہندوستان) میں پیدا کرتا یا بیجنگ (چین) میں مبعوث فرماتا یا عہد عروج کا ایتھنز آپ کی بعثت کے لئے منتخب کیا جاتا تو کیا کارِ رسالت تیئیس سال میں مکمل ہو جاتا قرآن مجید سنسکرت، چینی یا یونانی زبان میں نازل کیا جاتا تو کیا اس کی پذیرائی کی رفتار یہی ہوتی؟ ان ملکوں میں تو لوگ پوچھتے: یہ اللہ کون ہے؟ اس نام کا کوئی خدا ہم نے تو سُنا نہیں۔ زُس Zeus سے برتر بھی کوئی ہے یا یہ زُس ہی کا دوسرا نام ہے۔ بارہ بڑے اولمپین خداؤں میں تو اس کا نام کہیں نہیں آتا۔ ہومر کے ہاں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں۔ کرونس تو اپنے بیٹوں کو پیدا ہوتے ہی کھا جاتا تھا ای اس کی بیوی ریا Rhrs صرف چار بچوں کو بچا سکی تھی جن میں زُس بھی شامل تھا۔ اس نے باپ کو معزول کر کے اولمپس سے نکال دیا اس کے بعد سے وہی اب رب الارباب ہے تو کہیں یہ زُس ہی کا دوسرا نام تو نہیں، رومنوں نے ہمارے دیوتاؤں کے نئے نام رکھ لئے تھے۔ ہوسکتا ہے کسی دوسری قوم نے زُس کو اللہ بنا دیا ہو۔ لیکن اس کے ماں باپ کا تو علم ہونا چاہیے۔ سنا ہے اس کی کوئی بیوی بھی نہیں تھی ''لم یلد ولم یولد'' یہ کیسا خدا ہے جو اعزہ واقارب سے بھی محروم ہے، جس کا مولد ومنشا بھی معلوم نہیں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ رہتا کہاں ہے، اسے ہم کہاں ڈھونڈیں اور اس پر چڑھاوے کہاں چڑھائیں؟ عیسائی علماء مبلغین مثلاً سینٹ پال کو اس صورت حال سے پالا پڑا ہوگا لیکن اس وقت تک عیسائیت اپنے جوہر توحید سے عاری ہو کر خود دیومالائی شکل اختیار کر چکی تھی۔

ہندوستانی بت پرست کہتے اللہ نام کا کوئی خدا ویدوں میں تو موجود نہیں۔ مہابھارت اور رامائن میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں۔ کیا وہ کبھی اوتار کی شکل میں زمین پر اُترا ہے۔ وہ کس کا اوتار ہے؟ وشنو کا؟ اس کی شکتی (استری) کون ہے اور وہ کن امور کی نگران ہے وہ کن کن حیثیتوں سے پوجی جاتی ہے اس کی سواری کا جانور کونسا ہے۔ کیا اللہ نے مہابھارت میں شرکت کی تھی؟ شاید یہ کوئی ایرانی دیوتا ہو لنکا والوں نے کچھ نئے خدا بنائے تھے لیکن اللہ ان میں بھی شامل نہیں۔ تری مورتی تین خداؤں پر مشتمل ہے: برہما، وشنو اور شیو، ہاں ان سے اوپر پرماتما (ایشور) مانا جاسکتا ہے مگر وہ تب نرگن ہے جبکہ اللہ کے صفات بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ وہ رحیم ہے رحمٰن ہے، علیم وخبیر ہے، خالق ومالک اور جبار وقہار ہے حالانکہ یہ صفات تری مورتی والوں اور ان کی شکتیوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ خاصی الجھن ہے، ویدوں میں تینتیس ۳۳ دیوتا تھے جن کے نام یاد رکھے جاسکتے تھے پھر تینتیس ۳۳ کروڑ ہو گئے، اتنے نام کسی پنڈت تو کیا کسی مہارش کو بھی یاد نہیں ہوں گے کہ ہمارا دھرم بہت وسیع اور وسعت پذیر ہے۔ یہ اللہ ہی ان ۳۳ کروڑ میں سے کوئی، کون سب کے نام یاد کرتا پھرے۔

یونان ،روم ،بابل ،ہند اور سکنڈے نیو یا کے برعکس عربوں کے ہاں اپنی کوئی وسیع اور مربوط مائیتھالوجی (دیو مالا) موجود نہ تھی۔ مکہ، طائف اور مدینہ کے لوگ بت پرست تھے مگر ان کے بت کسی دیو مالائی زنجیر میں پروئے ہوئے نہیں تھے۔ کوئی مربوط دیو مالائی نظام موجود نہ تھا۔ دیو مالا کو تقویت دینے والے مفکر، ادبا اور شعرا موجود نہ تھے جبکہ یونان ہند اور بابل میں دیو مالا کا ایک مربوط بلکہ ہمہ گیر نظام موجود تھا، ہومر جیسے عظیم فنکاروں نے اپنے حماسوں Epies کے ذریعے اسے تقویت دی۔ اسکائی لس، یوری پیڈیز اور سوفو کلیز نے زندگی کو دیو مالا گیر داور دیو مالا کو زندگی کے گرد اس طرح لپیٹ دیا کہ سیکولر فلسفی بھی اس میں الجھ الجھ جاتے تھے (ہندوستان میں بالمیک دیاس جی اور کالیداس نے بھی یہی کچھ کیا) سقراط کی دوستی مسلم۔ اس کی معقولیت میں بھی کلام نہیں مگر بت پرستی کی گنجائش سقراط کے ہاں بھی موجود تھی۔ سقراط پر مقدمہ چلا تو ایک الزام یہ بھی تھا کہ وہ یونانی دیوتاؤں کو نہیں مانتا۔ سقراط نے جواب دیا تھا کہ میں خدایان کہن کا دشمن نہیں لیکن بدکردار اور بدکیش خداؤں سے میری نہیں بنتی۔ اور اس نے اپنی وصیت میں شاگردوں سے درخواست کی تھی کہ میری طرف سے شفا کے دیوتا کو ایک مرغ چڑھا دینا۔

ہندو دیو مالا اور یونانی دیو مالا (بابلی اور سکنڈے نیوین بھی) اپنی اپنی جگہ مربوط اور پیچیدہ نظام ہیں وہ نظام فکر عوام الناس کے لئے اجنبی نہیں بلکہ مانوس زاویہ ہائے حیات تھے۔ ان میں تھوڑا بہت اضافہ تو کیا جا سکتا تھا مگر پہلے سے موجود دیوتاؤں کو یک لخت اکھاڑ کر پھینک دینا اتنا آسان نہ تھا رومنوں نے یونان کو فتح کر لیا مگر یونانی دیو مالا اس قدر مضبوط تھی کہ رومن حاکم ہونے کے باوجود ان دیوی دیوتاؤں کے محض نام بدل سکے۔ حاکم ہونے کے باجود یونانی دیو مالا کے غلام بن گئے۔

ہندوستان میں بدھ مت آیا جو ہندو مت کے خلاف ایک احتجاج تھا لیکن ہندی تہذیب کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ بدھ مت حکمرانوں کا مذہب بننے کے بوجود ہندوستان میں شکست کھا گیا اور ہندو مت کے اندر ہی جذب ہو گیا، ویسے بھی بدھ مت کوئی اتنا بڑا انقلاب لے کر نہیں آیا تھا کہ ہندو مت کے ساتھ اس کا گھمسان کا رن پڑتا۔ اگر اسلام کا آغاز ہندوستان سے ہوتا اور ہندو مت سے براہِ راست اسلام کی ٹکر ہوتی۔ ان کے ویدوں کے مقابلے میں قرآن مجید (بزبان سنسکرت ہی سہی) اتارا جاتا تو گھمسان کا رن پڑتا۔ مشیت ایزدی اس پر قادر تھی کہ اس صورت میں بھی دین حق کا بول بالا ہو لیکن یہ دنیا، دنیائے اسباب ہے، دنیائے معجزات نہیں اور مشیت ایزدی کو یہ منظور نہ تھا کہ اسلام کو محض معجزانہ حوادث کے نتیجے میں دین غالب بنا دیا جاتا اور جہاں تک دنیائے اسباب کا تعلق ہے تو یہاں کی تہذیب، یہاں کے تمدن، یہاں کے عقائد والہام، یہاں کے فلسفے، یہاں کی دیو مالا، یہاں کے رسوم عبادت، یہاں کے ذات پات کے نظام، غرضیکہ ہر شعبہ حیات میں اسلام کا ہندو مت سے تصادم ہوتا اور ہندو برہمن جو آج تک مذہبی اعتبار سے مقتدر طبقہ ہے اسلام کو آسانی سے

قبول نہ کرتا، ایک ہزار سال میں مسلمان حکمرانوں نے ''ستی'' کی رسم ختم کرنے کی نیم دلانہ سی کوششیں کیں جو کامیاب نہ ہوئیں۔ انگریز نے سخت قوانین نافذ کئے۔ پورے طور پر اب بھی ختم نہیں ہوئی۔ اکا دکا واقعہ سننے میں آتا رہتا ہے۔

بیوہ کے عقد ثانی پر اسلام نے زور دیا آج ساری دنیا اسے مان چکی ہے مگر ہندو پنڈت آج بھی دل سے اس کے خلاف ہیں۔ ناچ گانا ہندوستان میں عبادت کا جزو تھا، آج بھی ہے کیا ۲۳ سال میں ہندوستان ایک مسلم ریاست بن سکتا تھا؟ کیا ۲۳ سال میں ہند، یونان یا چین ایک مسلم معاشرے میں تبدیل ہوسکتا تھا؟ اتنی بڑی انقلابی تبدیلی کا آغاز حجاز ہی سے ہوسکتا تھا۔ اسلام مذاہب ابراہیمی کے سلسلے کا دین ہے، جس کے لئے اہل عرب میں قبولیت کی زیادہ گنجائش تھی۔ تحریف ضرور ہوئی مگر تورات اور انجیل موجود تھیں اور بعض اہل علم کو یہ بھی معلوم تھا کہ کہاں کہاں تحریف ہوئی ہے حبشہ میں جب مشرکین مکہ نے مہاجر مسلمانوں کو حبشہ سے نکلوانے کی کوشش کی اور ان پر الزام لگایا کہ وہ حضرت مسیحؑ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں اور آپ ہیں کہ ان دشمنانِ مسیح کو اپنے ہاں پناہ دئے ہوئے ہیں۔ اس طرح نجاشی کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کر کے اسے مسلمانوں سے بدگمان کرنے کی کوشش کی گئی، یہ ایک نازک مرحلہ تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مسلمانوں کے عقائد بعینہٖ وہ نہیں جو باستداد زماں عیسائیوں میں رواج پا گئے ہیں لیکن مسلمانوں نے فیصلہ یہی کیا کہ حق بات ہی کہی جائے گی، خواہ وہ عیسائیوں کے مروجہ عقائد سے متصادم ہو۔ چنانچہ دربار میں بلائے جانے پر حضرت جعفر طیارؓ نے سورۃ مریم کی تلاوت کی کہ یہ ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دین اسلام کے عقائد حق شناس نجاشی کو معلوم تھا کہ ابن اللہ کا نظریہ اور مسیح کے معبود ہونے کا عقیدہ مسیحیت کا اصل عقیدہ نہیں۔ چنانچہ نجاشی نے مشرکین مکہ کی شکایت کو درخور اعتنا نہ جانا بلکہ خود قرآن مجید سے متاثر ہوگیا۔

یہودی اور عیسائی عرب، شام، فلسطین، اردن اور مصر میں بستے تھے، اسلام ان کے انبیاء اور کتب کی تصدیق کرتا تھا ان کے عقائد، انبیاء اور کتب کے حوالے سے بات کی جاسکتی تھی اور کی گئی۔ حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ کی شخصیات ان کے علاقوں کے لوگوں کے لئے اجنبی نہیں تھیں۔ جزئیات وتفصیلات میں کہیں کہیں اختلاف تھا۔ تاہم بات کرنے کیلئے ٹھوس تاریخی، علمی اور دینی بنیادیں موجود تھیں جبکہ ہند، لنکا، چین، جاپان اور دنیا کے بہت سے دوسرے علاقوں میں یہ نام ہی مانوس نہ تھے۔

علمائے عمرانیات و بشریات کا کہنا ہے کہ ساری اقوام ایک خدا کے تصور کو بآسانی قبول کر لیتی ہیں جبکہ آریا اور دراوڑ ذہن اسے قبول کرنے میں متامل ہوتا ہے۔ اس میں جغرافیائی عوامل کو بھی خاصا دخل ہے۔ مرزا غالب کو آریائی ذہن کی اس کوتاہی کا احساس تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں:

رموزِ دیں نشناسم، درست، معذورم　　نہادِ من عجمی وطریق من عربی ست

سامی ادیان نے عرب دنیا میں جنم لیا، توحید خالص یہودیت، نصرانیت اور اسلام کے سائے میں پرورش پاتی رہی۔ نصرانیت میں تثلیث کا عقیدہ بعد میں داخل ہوا۔

اب لیجیے! تصورِ رسالت کا مسئلہ۔ تو یہ تصور بھی سامی ادیان ہی کے ساتھ مخصوص تھا۔ نبی یا رسول کا تصور ہندو مت کے لئے ہمیشہ سے اجنبی تھا۔ وہ رسول اور اوتار کے فرق کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ یہ بات تو انہیں صدیوں سے سمجھائی جارہی تھی کہ جب دنیا زیادہ گمراہ ہوجاتی ہے تو کوئی بڑا خدا (دیوتا) انسان کی شکل میں دنیا میں جنم لیتا ہے۔ اپنی زندگی انسانوں کے درمیان گزارتا ہے اور دنیا کو راہ راست پر لاکر پھر خداؤں کی دنیا میں چلا جاتا ہے لیکن یہ تصور کہ اللہ جو خدائے واحد ہے، اپنے کسی بندے کو اپنا رسول بنالیتا ہے اور وہ رسول جو انسانوں میں سے ہوتا ہے۔ بشیر، نذیر اور داعی الی اللہ بن کر لوگوں کو راہِ راست کی طرف بلاتا ہے، وہ انسان ہی ہوتا ہے انسان ہی رہتا ہے۔ البتہ اسے عام لوگوں سے جو بات ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے۔ وہ خدا سے احکام و اخبار حاصل کرتا ہے، وہ خدا نہیں ہوتا، وحی الٰہی آنے کے بعد بھی وہ خدا (الٰہ) نہیں بن جاتا۔ وہ اللہ کے رسول کے طور پر، اس کے حکم کے مطابق نیکی کا درس دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو الٰہ واحد ہے جب چاہے، اسے موت سے ہمکنار کردیتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں تو اوتار خود خدا ہوتا ہے جو ہندوؤں کی بھلائی کیلئے وقتی طور پر اور مصلحتاً آدمی بن جاتا ہے۔ رام کرشن مہاراج وشنو کے اوتار تھے۔ ہندوؤں کے اس عقیدۂ اوتار نے نہ جانے کن کن راہوں سے گزر کر عیسا دیت پر بھی یلغار کی اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رسول کی بجائے (یا، رسول ہونے کے علاوہ) اوتار کا درجہ دے دیا۔ (یہ بھی ممکن ہے کہ مسیح کے معبود ہونے کا عقیدہ مسیحی علماء کی اپنی کج فکری ہی کا نتیجہ ہو) تاہم یہودی، عیسائی اور مشرکین عرب نبی یا، رسول کا تصور رکھتے تھے۔ خانہ کعبہ میں ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی (فرضی) تصویر بھی دیوار پر نقش تھی، عرب کے یہودیوں کو کبھی یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ نبی کیا ہوتا ہے؟ وہ نبی اور نبوت کے تصورات سے آگاہ تھے۔ عیسائی کلیسا نے تعلیمات مسیحی کو مسخ کردیا، حضرت عیسیٰ کی حیثیت کو بدلنا چاہا، بدل بھی دیا مگر اہل علم مسیح جانتے تھے کہ رسول، اللہ نہیں ہوتا، ابن اللہ بھی نہیں ہوتا، اللہ کا شریک بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ حبشہ میں (جیسا کہ مذکورہ) مسلمانوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے قرآنی عقائد کا بیان کیا تو نجاشی کو حقیقت رسالت سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ بھولا ہوا سبق یاد آ گیا اور اس نے اسلام قبول کر کے حق کا اعتراف کیا۔

عرب بت پرست تھے، دیوی، دیوتاؤں کو پوجتے تھے مگر ایک تو ان دیوی، دیوتاؤں کی تعداد ہی بہت کم تھی (معروف دیوی دیوتا درجن بھر تھے) پھر ان میں ان رابطوں، قرابتوں اور رشتوں کا فقدان تھا جن سے کوئی دیومالا جنم لیتی ہے اور بمرورِ زماں مذہب کا درجہ حاصل کرلیتی ہے۔

عرب میں بت پرستی ضرور تھی اور بہت تھی لیکن یہ کوئی معاشرتی جبر بھی نہیں تھا کہ ہر شخص لازماً کسی ایک یا چند بتوں کا پجاری ہو۔ ایام جاہلیت میں حضور ﷺ کے علاوہ بھی ایسے لوگ موجود تھے جو بتوں کی پوجا نہیں کرتے تھے اور وہ لوگ اپنے مکارم الاخلاق یا قبیلے میں اپنے مقام کی وجہ سے معزز سمجھے جاتے تھے۔ بت پرست ہونا نہ لازمی تھا نہ لازمۂ عزت، حضور ﷺ نے کبھی بتوں کی پرستش نہیں کی اور کبھی کسی نے دھونس جمانے کی کوشش نہیں کی کہ حضور ﷺ! آپ (ﷺ) بتوں کی پوجا کیوں نہیں کرتے؟ (خیال رہے کہ مکہ میں پکے ملحد بھی موجود تھے) مشرکین مکہ وفد کی شکل میں شکایت لے کر آئے تو ابو طالب سے یہ نہیں کہا کہ اپنے بھتیجے سے کہو کہ ہماری طرح بتوں کی پرستش کرے۔ بس یہ کہا کہ ہمارے خداؤں (بتوں) کو برا کہنا چھوڑ دے لیکن یہ حضور ﷺ کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ مقاصد رسالت کی تو پہلی مشق ہی یہی تھی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ حضور ﷺ نے توحید کا اعلان کیا "لا الہ الا اللہ" اور اس کی وضاحت میں بتایا کہ لات ہو یا منات، عزیٰ ہو یا ہُبل، اساف ہو یا نائلہ۔ یہ تمہارے نفع وضرر پر قادر نہیں۔ ان کی پرستش شرک ہے الہ صرف اللہ ہے۔ سارے اختیارات اسی کے پاس ہیں اور وہ شرک کو معاف نہیں کرتا۔ تم بت پرستی کر کے جہنم کی طرف جا رہے ہو۔ یہ بت، یہ فرشتے، یہ ستارے اللہ کے ہاں تمہاری سفارش نہیں کر سکتے، تب مشرکین کو حرارہ آیا کہ ہائیں! یہ صادو امین، مقبول اور شریف انسان کیسی اشتعال انگیز باتیں کرتا ہے۔ (نعوذ باللہ) عربوں نے بت پرستی کی حد کر دی مگر کسی مربوط دیومالا کو جنم نہ دے سکے۔ جس عرب کا جی چاہتا، وہ کہیں بھی، ایک پتھر گاڑ دیتا، اسے معبود قرار دیتا اور اس کا طواف کرتا۔ ان پتھروں کو جو خانہ کعبہ کے گرد گڑے ہوئے تھے، "انصاب" کہا جاتا تھا۔

بخاری میں ابو رجا العطاردی سے روایت ہے کہ ہم لوگ پتھر کو پوجتے تھے اگر کوئی اس سے اچھا پتھر مل جاتا تو پہلا پھینک کر یہ نیا لے لیتے۔ اگر پتھر نہ مل سکا تو مٹی کا ایک ڈھیر بناتے، اس پر بکری کو لا کر دوہتے پھر اس کا طواف کرتے۔ یثرب میں لکڑی کے بت بھی عام تھے جو گھروں میں رکھے جاتے تھے۔ ان کی کوئی معین شکل بھی نہیں ہوتی تھی۔ البتہ ان سب کا مشترک نام "منات" تھا۔

بت پرست معاشرے مجسمہ تراشی کے فن کے لئے نہایت موزوں فضا مہیا کرتے ہیں۔ مجسمہ سازی اور بت تراش لوگ معزز سمجھے جاتے ہیں۔ یونان، مصر اور ہند میں بت تراشی کا فن بہت ترقی کر گیا۔ یہاں بت تراشی کیلئے سازگار فضا موجود تھی۔ لنکا، ہند اور افغانستان میں پہاڑوں پر کندہ کئے ہوئے اور چٹانوں کو تراش کر بنائے ہوئے جو لاتعداد بت موجود ہیں اس سازگار فضا کا نتیجہ ہیں جو ہندو مت اور بدھ مت کے عہد عروج میں ان علاقوں میں موجود تھی۔ بت ساز ہاتھ سے بت تراش لیتے اور چٹانوں کو چھینی والی چھینیاں بھی مقدس تھیں۔ یہ سب کام بغرض عبادت کیا گیا تھا۔ اسکندریہ کی چٹانوں، ایلورا اجنتا کے غاروں اور ہندو لنکا کے مندروں میں جو مذہبی مصوری نظر آتی ہے۔ اس کے پیچھے مذہبی جوش و

خروش بھی نظر آتا ہے۔عرب کا مذہبی مصوری، بت تراشی وار بت سازی کے فن میں کوئی مقام نہیں۔کیونکہ عرب بت پرست ضرور تھے لیکن بتوں کی اس مربوط دیومالا سے محروم تھے، جس سے فنکار اکتساب فیض کر سکتے۔اس لئے عربوں کو توحید کے تصور سے آشنا کرنا اور بت پرستی سے متنفر کرنا نسبتاً آسان تھا۔

بت پرستی کے ساتھ بالعموم اور دیومالائی مذاہب کے ساتھ بالخصوص دیوداسیوں کا تصور بھی شامل ہے۔دیوداسیوں کا وجود بابلی تہذیب (اکادی وسمیری) اور قدیم ہندو تہذیب کا جزو رہا ہے، گل گامش کی داستان سومیزی (بابلی) روایت کی قدیم دستاویز ہے۔دیوداسی یہاں بھی بے حیائی کے ساتھ موجود ہے۔اناطولفرانس کی ''تائیس'' میں مصر و لیبیا کی نصرانی راہبات کا ایک جامع نظام دکھایا گیا ہے اور اس غیر فطری نظام سے جو مکروہات پیدا ہوتے ہیں، ان کا تذکرہ بھی موجود ہے۔بعض یورپی مفکرین نے تو بے جا تعمیم سے کام لے کر یہاں تک کہ عصمت فروشی کا پیشہ معبدوں ہی سے شروع ہوا۔عرب بت پرست تھے، عورت کی عزت نہیں کرتے تھے لیکن لات اور عزیٰ کے معبدوں کو انہوں نے عصمت فروشی کے مراکز نہیں بننے دیا۔

قریش جوا کھیلتے تھے۔جُوا آج بھی کھیلا جاتا ہے۔میلوں ٹھیلوں میں سرکس کے ساتھ جوئے کا دھندا بھی رہتا ہے، کرکٹ کے مقابلوں میں اور گھوڑ دوڑ میں جُوا ہوتا ہے۔متمدن دنیا کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں شرفاء جُوا کھیلتے ہیں۔جُوا ایک برائی ہے جس کی کسی صورت حمایت نہیں کی جاسکتی لیکن قریش کے ہاں جوئے کی ایک بڑی وہ قسم تھی جو فیاضی کے اظہار کیلئے تھی، یہ اونٹ کے گوشت پر کھیلا جاتا تھا، یہ گوشت، جیتنے والا قمار باز گھر نہیں لے جاتا تھا، بلکہ غریبوں میں بٹ جاتا تھا، جب شہر میں کہیں اس قسم کا جُوا ہوتا تھا، غریبوں کی عید ہو جاتی تھی۔لیکن یہ بھی آخر جُوا تھا۔جوئے کی دوسری قسموں کے ساتھ یہ بھی حرام قرار پایا۔تجارت کی بعض صورتوں میں بھی جوئے کا شمول، احتمال یا اشتباہ ہوتا تھا۔اسلام نے جوئے کو اس طرح حرام قرار دیا کہ تمام تجارتی معاملات انصاف کے دائرے میں آگئے اور قمار بازی وجہ مفاخرت بھی نہ رہی۔

اعلانِ رسالت کے بعد مکہ کے لوگ حضور ﷺ کے دشمن ہو گئے۔اشرارِ مکہ حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دیتے تھے لیکن ابوجہل، ابولہب، امیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط جیسے دشمنوں کے اس شہر میں بھلے لوگ بھی تھے جو موقع ملنے پر حضور ﷺ اور ان کے ساتھیوں کی اعلانیہ اور خفیہ مدد کرتے تھے۔حضرت عثمان بن مظعون ہجرت کر گئے۔حبشہ میں مقیم تھے، ایک غلط خبر پر واپس آئے تو ولید بن مغیرہ کی حمایت حاصل کی۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ابن الدغنہ قارہ نے امان دی اور قریش نے اس امان کو تسلیم کیا۔حضور ﷺ سفرِ طائف سے زخمی اور نڈھال ہو کر واپس آئے تو مطعم کی پناہ میں مکہ میں داخل ہوئے۔مطعم نے اپنے دس بیٹوں کو مسلح کر کے بھیجا کہ جاؤ، خانہ کعبہ کے پاس جا کر اعلان کرو ''محمد (ﷺ) میری امان میں ہیں'' حضور ﷺ اپنے پچاس ساتھیوں کے ساتھ شعب ابی طالب

میں محصور رہے۔ یہ معاشرتی بائیکاٹ تھا مگر نیک دل لوگ شعب ابی طالب میں بھی کسی نہ کسی طرح آپ کی مدد کرتے رہے۔ وہ لوگ جنہوں نے اس ظالمانہ معاشرتی مقاطعہ کے خلاف آواز اٹھائی، وہ غیر مسلم ہی تھے مگر بھلے لوگ تھے۔

سعید بن زیدؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، ان کے والد زید (بعثتِ نبوی کے پہلے بھی) حنیف تھے، دین ابراہیمی کے پیرو تھے، بتوں پر چڑھایا ہوا ذبیحہ نہیں کھاتے تھے۔ کفر و شرک سے متنفر تھے۔ حضور ﷺ کے اعلانِ رسالت سے پہلے وفات پا گئے۔ ابوالعاص بن ربیع (اسلام کی خاتون اوّل حضرت خدیجہؓ کے بھانجے، خدیجہؓ کی بہن ہالہ کے بیٹے) داماد رسول یعنی بنت رسول حضرت زینبؓ کے شوہر تھے، تجارت کرتے تھے، دیانتداری مسلم تھی، لوگ ان کے پاس اپنی امانتیں رکھتے تھے اور وہ لوگوں کا مال لے کر تجارت کیلئے دوسرے ملکوں کا سفر کرتے تھے۔ انہوں نے اسلام دیر میں قبول کیا مگر تاجرانہ دیانت اور غریب پروری کے باعث ہمیشہ معزز و محترم سمجھے جاتے تھے رہے۔ ایام جاہلیت کے معاشرے میں بھی تاجرانہ دیانت بڑی حد تک موجود تھی، بددیانت تاجر ہر جگہ ناقابل اعتبار ہوتے ہیں۔ اہل مکہ میں کوئی شخص بددیانت تاجر کہلوانا پسند نہیں کرتا تھا۔ بددیانت تاجر کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ حلف الفضول ایسی ہی ایک بددیانتی کے خلاف دیانتدار لوگوں کا اتحاد تھا۔

وہ لوگ بھی بھلے لوگ ہی تھے جنہوں نے اکیلی خواتین کو ہجرت کرنے میں مدد دی، حالانکہ وہ خود اس وقت تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے۔ (تفصیل آگے آئے گی)

ایام جاہلیت کی تصویر کو تاریک تر بنانے کیلئے اس بات پر بہت زور دیا جاتا ہے کہ عرب اپنی بچیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ دخترکشی کی یہ مذموم رسم بنو تمیم میں تھی۔ دیگر قبائل میں بھی اس قسم کا کوئی اکا دکا واقعہ پیش آتا ہوگا، تاہم اکثر قبائل اس قبیح رسم سے متنفر تھے اور اس ظالمانہ رسم کے خلاف صلحا کا ایک محاذ بھی قائم کیا تھا۔ شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ اور زید بن عمر بن نفیل اس تحریک کے سرگرم کارکن تھے۔ کسی عورت سے اس کا بچہ چھین کر ہلاک کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ حضورؐ نے تو قریش کی عورتوں کی تعریف کی وہ بچوں پر بچپنے میں بہت مہربان ہوتی ہیں اور خاوند کے مال کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ دخترکشی کی رسم برصغیر میں بھی موجود تھی اور معاشرتی اور معاشی عوامل کے تحت اکا دکا واقعات آج بھی سننے پڑھنے میں آتے رہتے ہیں۔ ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش کے سرکاری ذرائع ابلاغ آج اکیسویں صدی میں بھی اپیلیں کر رہے ہیں کہ لڑکیوں کو بوجھ نہ سمجھو۔ یہ بات آپ کو پہلی نظر میں عجیب معلوم ہوگی کہ برصغیر کے لوک گیتوں میں جو لوریاں شامل ہیں وہ سب کی سب لڑکوں کے لئے بنی ہیں، لڑکیوں کیلئے لوریاں موجود نہیں لیکن اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ جس معاشرے میں لڑکی کی ولادت پر والدین کو مبارکباد کہنا بھی بدتمیزی سمجھا جاتا ہو اور لڑکیاں جننے والی عورت کو منحوس جانا جاتا ہو وہاں بچیوں کے لئے لوریاں کون بنائے اور کون گائے؟ اردو اور پنجابی میں لڑکیوں کے لئے اوّلین لوریاں پر چہرے سیاہ ہو جاتے ہیں۔ عرب میں دخترکشی موجود تھی لیکن اتنی بھی نہیں بلکہ ایام جاہلیت کے بعض عرب تو بچیوں کے نام پر اپنی کنیت

اختیار کر لیتے تھے۔

آج جسم فروشی کا کاروبار دنیا میں متعدد شکلیں اختیار کر چکا ہے اور اسے بڑے دلکش اور مہذب نام دیئے گئے ہیں۔ جسم فروش ایام جاہلیت کے معاشرے میں بھی موجود تھی مکہ میں جسم فروش عورتیں موجود تھیں جو جھنڈی والیاں کہلاتی تھیں، عناق، مکہ کی ایک جسم فروش عورت کا نام ریکارڈ پر موجود ہے۔ مدینہ میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی اپنی لونڈیوں سے بدکاری کراتا تھا۔ اسلام نے ان برائیوں کا سدِ باب کیا لیکن جاہلیت کے اس بدترین معاشرے میں بھی جسم بیچنے والیاں باعزت نہیں سمجھی جاتی تھیں، ان سے آٹوگراف نہیں لئے جاتے تھے وہ آرٹسٹ یا سنار نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ شرفا کی بہو بیٹیوں کا ان سے ملنا ممنوع تھا۔ ناچنے گانے سے شرفا پہلے ہی مجتنب تھے یہ کام لونڈیاں باندیاں کرتی تھیں۔ شرفا کی بچیاں خوشی کے موقع پر دف بجاتی اور فخر و مباہات کے اشعار گاتی تھیں اسلام نے اس سے تعرض نہیں کیا۔

بیوہ کے نکاح ثانی کی روایت دور جاہلیت میں بھی موجود تھی اور ہندو دھرم کے برعکس اسے قطعاً معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے اس اچھی روایت کو جاری رکھا بلکہ بیوہ کے نکاح کی ترغیب دی حضور ﷺ اور صحابہؓ کے عمل سے اس روایت کو تقدیس ملی جبکہ آج بھی ایسے معاشرے موجود ہیں جہاں بیوہ کے نکاح ثانی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ ازدواج کا بندھن ایک مقدس معاہدہ ہے نبھانا لازم ہے لیکن جب میاں بیوی میں مفاہمت و مصالحت کے راستے مسدود ہو جائیں اور ازدواج کا بندھن روگ بن جائے تو علیحدگی ہی اس کا حل ہے۔ چنانچہ نکاح کے تمامتر تقدس کے باوجود علیحدگی کا حق ایک اخلاقی اور معاشرتی تقاضا بن جاتا ہے۔ وہ مذاہب جن میں مرد یا عورت کو کسی بھی حالت میں ازدواجی بندھن توڑنے کا حق حاصل نہیں، اپنی جگہ کھڑے جھلاتے رہے اور ان کے پیروکاروں نے سیکولر قانون سازی کے ذریعے یہ حق (مذہب کی منشا کے خلاف) حاصل کر لیا۔ جاہلیت کے مجازی معاشرے میں عورتیں مظلوم ضرور تھیں مگر شوہر سے علیحدگی کا حق انہیں حاصل تھا اور وہ اپنے حق کا استعمال بھی کرتی تھی لیکن یہ حق استعمال کرنا آسان نہ تھا۔ بڑے گھرانوں کی دلیر اور مالدار خواتین یہ حق استعمال کر سکتی تھیں عام غریب عورتوں کے لئے یہ حق استعمال کرنا بہت مشکل تھا۔ اسلام نے ضلع طلاق، لعان وغیرہ کے قوانین بنائے تاکہ جبر کی ہر شکل کی نفی ہو جائے۔ علیحدگی اور علیحدگی پر ندامت کی ہر صورت منصفانہ بن جائے امیر اور خاندانی عورتوں کو تو علیحدگی کا حق پہلے ہی حاصل تھا، اسلام نے اسے غریب اور مظلوم عورتوں تک پہنچایا۔

عورتوں کے احترام کے لحاظ سے جاہلیت کا عرب معاشرہ کوئی مثالی معاشرہ تو نہ تھا لیکن اُمِ سلمہؓ اور اُمِ کلثومؓ بنت عقبہ بن ابی معیط کی ہجرت کے واقعات یہ ظاہر کرنے کو کافی ہیں کہ اچھے لوگ بالعموم عورت کا احترام کرتے تھے اور پریشانی میں عورتوں کی مدد کرنا ضروری جانتے تھے۔ اُمِ سلمہؓ کی ہجرت کا واقعہ یوں ہے کہ حضرت ابوسلمہؓ اپنی بیوی اُمِ سلمہؓ اور بچے (سلمہ) کو ساتھ لے کر ہجرت کے لئے مکہ سے نکلے تو سسرالیوں (بنی مغیرہ) نے روک لیا۔ وہ بیوی بچے کو چھوڑ کر

ہجرت کر گئے۔ بچے (سلمہ) کو اُمِ سلمہؓ کے خاندان والے چھین کر لے گئے اُمِ سلمہؓ روز گھر سے نکلتیں اور ابطح میں بیٹھ کر رویا کرتیں چند دن بعد وارثوں کو رحم آ گیا اور شوہر کے پاس جانے کی اجازت مل گئی وہ بچے کو لے کر اونٹ پر بیٹھ گئیں اور مدینہ کی طرف روانہ ہوئیں کوئی مرد ساتھ نہ تھا تنعیم میں عثمان بن طلحہ کلید بردار کی نظر پڑی اس نے اونٹ کی مہار پکڑی اور مختلف منزلوں پر قیام کرتا ہوا قبا تک آیا اور بولا: تمہارے شوہر یہیں مقیم ہیں اب تم ان کے پاس چلی جاؤ اور خود واپس مکہ کا راستہ لیا۔ یاد رہے کہ عثمان بن طلحہ اس وقت تک مشرف بالاسلام نہیں ہوا تھا اور مکہ میں کلید کعبہ طلب کرنے پر اس کی حضور ﷺ سے جھڑپ بھی ہو چکی تھی۔

دشمن اسلام عقبہ بن ابی معیط کی بیٹی اُمِ کلثومؓ اسلام لے آئیں انہوں نے صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت کی وہ پاپیادہ تھیں۔ خزاعہ حضور ﷺ کے حلیف تھے، چنانچہ خزاعہ کے ایک شخص کو ساتھ لیا اور مدینہ پہنچ گئیں۔ دوسرے دن ان کے بھائی انہیں واپس لینے کیلئے مدینہ پہنچ گئے اور معاہدہ حدیبیہ کی رو سے ان کی واپسی پر اصرار کیا اُمِ کلثومؓ نے فریاد کی "میں عورت ہوں، کمزور ہوں، مجھے اپنے ایمان کا ڈر ہے" (یہ نہیں کہ مجھے اپنے قتل کئے جانے کا ڈر ہے) وہ خطہ جہاں اس طرح کے جذبات کا ہیولا موجود تھا چند سال بعد ایسے خطہ امن میں بدل سکتا تھا کہ ایک عورت حیرہ سے حضرموت تک اکیلی سفر کرے اور اسے سوائے خدا کے کسی کا ڈر نہ ہو۔

زمانہ جاہلیت کی تصویر کو تاریک تر بنانے کے لئے یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ عورت کو کھلونا سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ آج کی متمدن دنیا تذلیل صنفِ نازک میں تاریخ عالم کے ہر غیر متمدن دور سے آگے ہے۔ کہیں فیشن پریڈ میں، کہیں مقابلہ حسن میں، کہیں ملبوسات کی نمائش کی غرض سے اور کہیں محض گلیمر کے لئے عورت کو رسوا کیا جا رہا ہے حتیٰ کہ فلم کا اشتہار ہو یا قلم کا، عورت ماڈل کے طور پر موجود ہے۔ صابن یا شیمپو کا کوئی اشتہار تو عورت کی تذلیل کے بغیر مکمل ہی نہیں سمجھا جاتا اور اگر عورت کو کھلونا سمجھنے سے مراد مردوں کی ہوس رانی ہے تو اہل عرب سے زیادہ بعض دوسری اقوام اور تہذیبیں مورد الزام ٹھریں گی۔ اگر مراد یہ ہے کہ مرد ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے تو کیا متمدن ہنداس سے پاک تھا؟ یہاں بھی انواس عورتوں سے بھرے پڑے تھے بلکہ اسے مذہبی سند حاصل تھی۔ رامائن کے مطابق راجا دسرتھ کی تین بیویاں تھیں اور تین سو پچاس لونڈیاں۔ افریقہ کے اکثر حصوں میں جو عیسائیت کے اثر سے آزاد تھے بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہ تھی عرب معاشرے میں بھی بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہ تھی اسلام نے اسے چار تک محدود کر دیا اور وہ بھی شرط عدل کے ساتھ۔ عرب نے کبھی اباحت نسواں کو تسلیم نہیں کیا حالانکہ یونان کے عہد عروج میں افلاطون نے اپنی جمہوریہ میں اباحت نسواں کا محدود سا تصور پیش کیا تھا جو عملی زندگی میں دو قدم نہ چل سکا۔ البتہ ادھر ایران میں مزدکیت کی تحریک کے تحت اس کو عملی شکل دی گئی لیکن اس سے معاشرے میں وہ بگاڑ اور انتشار پیدا ہوا کہ پورا معاشرہ چیخ اٹھا اور بالآخر اسی اباحتِ نسواں

کے حیوانی تصور کے باعث مزدکیت کی تحریک ناکام ہوگئی اور خدنیں غسل کے بعد دفنادی گئی۔

ایام جاہلیت کی ایک اور برائی کا بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ فاحشائیں ایک سے زیادہ لوگوں کے ساتھ تعلق رکھتی تھیں (فاحشہ پر کسی ملک کے قانون نے پابندی نہیں لگائی کہ وہ فاحشہ بھی ہو اور ایک مرد کی ہو کر رہے) البتہ کوئی فاحشہ حاملہ ہو جاتی، بچہ پیدا ہو جاتا تو قیافہ شناس فیصلہ کرتے یا وہ فاحشہ خود فیصلہ کرتی کہ بچہ کس کا ہے اور بالعموم اسے ماننا پڑتا۔ اس طرح بچے کو ولدیت مل جاتی اور کچھ معاشی فوائد بھی حاصل ہو جاتے تاہم یہ جسم فروشی ہی تھی، جس کا کوئی جواز نہ تھا اہل عرب اسے پسند بھی نہیں کرتے تھے چند شوہری کو عرب نے کبھی قبول نہیں کیا جبکہ تبت سمیت ہند میں اس کے لئے دیومالائی جواز تلاش کر لئے گئے تھے۔ دروپدی کے پانچ شوہر تھے۔ پہلے اس کی تاویل کی گئی کہ یہ تمثیل ہے روح کے ساتھ حواسِ خمسہ کے تمسک کی اور اب نئی ہندو نسل کھلم کھلا اس دیومالائی کہانی کا مذاق اڑا رہی ہے۔

بعض ماہرین عمرانیات نے مادرسری معاشرے کو پدری معاشرے پر مقدم ٹھہرایا ہے جس میں ماں خاندان کی سربراہ ہوتی ہے اور باپ مجہول ہوتا ہے۔ ماہرین عمرانیات بیسویں صدی کے وسط تک نور یافت قبائل میں پہنچ کر اس احمقانہ مفروضے کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

قصاص اور دیت کے قوانین ایام جاہلیت میں موجود تھے لیکن ان پر صحیح عملدرآمد نہیں ہوتا تھا۔ بارسوخ افراد اور بے رسوخ افراد برابر نہیں تھے، آزاد اور غلام برابر نہیں تھے، طاقت ور قبائل اور کمزور نہیں تھے۔ اس لئے انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے تھے۔ اسلام نے حکم دیا سب لوگ قصاص اور دیت میں برابر ہیں انصاف کے معاملے میں بڑے اور چھوٹے، امیر اور غریب، بارسوخ اور بے رسوخ میں امتیاز نہیں ہو سکتا۔

عروہ بن مسعود ثقفی نے صلح حدیبیہ کے وقت سفیر قریش کی حیثیت سے حضور ﷺ سے گفتگو کی۔ مغیرہ بن شعبہ کی مداخلت پر سخت جملہ کہا اور احسان یاد دلایا۔ ابوبکر صدیقؓ کی مداخلت پر اپنے مرہون احسان ہونے کا ذکر کیا، یہ دونوں واقعات ادائے دیت میں معاونت ہی کے واقعات تھے عروہ بن مسعود ثقفی نے مغیرہ بن شعبہ کے ساتھ ادائے دیت میں تعاون کیا تھا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ادائے دیت ہی کے کسی معاملے میں عروہ بن مسعود ثقفی کی مدد تھی۔

مختصر یہ کہ ایام جاہلیت میں عربوں کے ہاں اللہ کا نام موجود تھا، اور خدائے بزرگ و برتر بھی وہی تھا۔ اب اسے الہ واحد کے طور پر منوانا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نام کسی تعارف کا محتاج نہ تھا۔ اکثر قبائل انہی کی اولاد تھے یا انہی کی اولاد ہونے کے مدعی تھے۔ خانہ کعبہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک فرضی تصویر بھی موجود تھی۔ قرآن مجید لوگوں کو دین ابراہیمی کی طرف بلاتا تھا یعنی ایک بھولے ہوئے سبق کو یاد دلاتا تھا۔ یہودی اور عیسائی عرب شام، مصر، فلسطین اور حبشہ میں بستے تھے۔ ان کے عقائد، رُسل اور کتب کے حوالے سے بات کی جا سکتی تھی، عربوں کی کوئی اپنی دیومالا نہیں تھی جو توحید

کی راہ میں رکاوٹ بنتی۔

اب چند ایسے امور کا سرسری ذکر کیا جاتا ہے جو حجاز کو بعثتِ ختم المرسلین اور نزول قرآن کے لئے موزوں ترین مقام بنا دیتے ہیں۔ ایام جاہلیت میں بھی خانہ کعبہ محترم تھا۔ اس کی حرمت مسلمہ تھی حضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں خانہ کعبہ کی تعمیر نو ہوئی تھی خانہ کعبہ پر غلاف بھی چڑھایا جاتا تھا۔ ایام جاہلیت میں بھی حج ہوتا تھا، حجر اسود کی تعظیم کی جاتی تھی۔ کعبہ کا طواف تھا، صفا و مروہ کی سعی تھی۔ جانوروں کی قربانی بھی دی جاتی تھی۔ البتہ مناسکِ حج میں کچھ بدعات شامل ہوگئی تھیں جن سے حج کو پاک کرنا تھا، تلبیہ بھی تھا مگر اس میں کچھ مشرکانہ جملے اضافہ کر لئے گئے تھے یہ جملے حذف کرنا تھے۔ آب زمزم کو مقدس و متبرک مانا جاتا تھا۔ حج کیلئے ذی الحجہ ہی کا مہینہ معین تھا اگرچہ نسی کے قاعدے نے اس میں گڑبڑ کر دی تھی، عمرہ بھی تھا۔ آداب عمرہ بھی تقریباً وہی تھے۔ حج و عمرہ کو آلودگیوں سے پاک کرنا تھا۔ عرب فرشتوں کو مانتے تھے اور انہیں خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔ اسلام کو فرشتوں کا وجود ثابت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف یہ منوانا تھا وہ خدا کی بیٹیاں نہیں اور خدا کی خدائی میں شریک نہیں۔

عرب اپنے مردوں کو کفناتے اور دفناتے تھے اسلام نے بھی یہی طریقہ باقی رکھا، ختنہ مروج تھا اسلام نے اسے باقی رکھا۔ مشاورت کا طریق حجاز میں مروج تھا۔ مجلس مشاورت بھی موجود تھی (دارالعوام بھی اور دارالامرا بھی) اہم فیصلے مشاورت ہی سے کئے جاتے تھے۔ قرآن مجید نے مشاورت کی اہمیت بڑھائی اور یوں شورائی نظام اعلیٰ نظم و نسق اور عدل و انصاف کا ضامن بن گیا۔ رضاعت کے رشتوں کا وہ احترام جو عرب میں تھا، اس درجے میں شاید دنیا کے کسی خطے میں موجود ہو۔ رضاعت ایک رواج کے طور پر موجود تھی۔ رضاعی ماں باپ اور بہن بھائی کا احترام کیا جاتا تھا۔ اسلام نے رضاعت کے رشتوں میں تقدیس اور حرمت پیدا کی۔

فخر و مباہات اہل عرب کی گھٹی میں پڑے تھے۔ جب اسلام وجہ افتخار بنا تو انہوں نے اسے تاج سلطانی سمجھ کر سروں پر سجایا عربوں کو زبان پر ناز تھے۔ شعر گوئی اور شعر فہمی عام تھی۔ نزاکتوں کو سمجھتے تھے۔ قرآن مجید کو بطور معجزہ پیش کرنے کی گنجائش موجود تھی۔ عرب عام طور پر صادق الوعد تھے، مہمان نواز تھے، بہادر تھے، غیرت مند تھے، آن پر کٹنا مرنا جانتے تھے۔ اسلام لائے تو یہی خوبیاں اسلام کا بول بالا کرنے کام آئیں۔

غرضیکہ بعثتِ ختم المرسل اور نزول قرآن مجید کے لئے کرۂ ارض پر بہترین اور مناسب ترین جگہ خطہ حجاز ہی تھی اور حجازی معاشرہ اپنی تمامتر جاہلیت کے باوجود قبول حق کے لئے موزوں ترین معاشرہ تھا۔

(بشکریہ: ماہنامہ ''الرشید'' لاہور)